© rasailojaraid.com

رُودادِ ابتلاء: احمد رائف مصری

جناب خلیل الحامدی صاحب

(۹)

ہم میں سے دو دو افراد کو ہتھکڑی پہنا دی گئی - اور ان سب ہتھکڑیوں کو ایک لمبی زنجیر میں پرو دیا گیا - یوں یہ پورا گروہ ایک مربوط قافلہ بن گیا جسے نہ صرف لوہے کی ہتھکڑیوں نے باہم مربوط کر رکھا تھا بلکہ درد و الم کا رشتہ بھی سب میں مشترک تھا - جلاد ہماری آنکھوں پر پٹی باندھنا بھی نہ بھولے - یہ کام بھی اُنہوں نے کر ڈالا اور ایسے کرنے کے لیے تشدد و توہین کے وہ تمام اسلوب اختیار کیے جو اُن کا معمول تھا - مثلاً لکد کوبی، فحش گوئی اور لکھ زنی - چلتے وقت انہوں نے ایک اور وارننگ ہمیں دے دی - وہ یہ کہ "جو شخص راستے میں لب کشائی کریگا اُسے گولی مار دی جائے گی، اور اس کے ساتھ قطعاً رحمدلی کا برتاؤ نہیں کیا جائے گا" اس وارننگ کا کوئی وزن نہیں تھا - اس لیے کہ ہم میں سے کسی انسان کے اندر کوئی بات کرنے کی نہ خواہش تھی اور نہ سکت - ہم فوجی جیل کی طرف جا رہے تھے جہاں موت انتظار کر رہی تھی - اور موت بھی ہماری نظروں میں کوئی ایسی چیز نہ رہی تھی جس سے ڈرا جائے - بلکہ ڈر تھا عذابِ الیم کا -

ہماری اس کھیپ کے اندر دو فوجی سپاہی تھے - ہم خوف و دہشت کے مارے لرزہ براندام تھے اور وہ ہم سے ٹھٹھول کرتے تھے اور گالیوں سے ہمیں نوازتے تھے - ایک سپاہی بولا: "تم پر آسمان والے کا بڑا رحم ہوگا اگر تمہاری یہ پوری کھیپ نہر میں جا پڑے اور پوری کی پوری ڈوب کر مر جائے" اُس نے جب یہ بات کہی اُس وقت قیدیوں کی گاڑی اسماعیلیہ نہر سے گزر رہی تھی اور اُس کے آگے اور پیچھے پولیس کی گاڑیاں تھیں - دوسرا سپاہی بھی بول اُٹھا کہ: "تمہیں کیا معلوم کہ جس جہنم کی طرف تم جا رہے ہو وہاں تم پر کیا گزرنے والی ہے"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سپاہیوں کے الفاظ سن کر میرے ہونٹوں پر بے ساختہ مگر آہستہ آہستہ پورے سوز و درد کے ساتھ یہ دُعا جاری ہو گئی کہ خدا اس سپاہی کی دُعا قبول فرما لے۔ ہماری گاڑی نہر میں جا پڑے اور ہم سب غرق ہو جائیں ——— بلکہ میں تو یہ تمنا بھی کرنے لگا کہ کیا اچھا ہوتا کہ مجھے گذشتہ روز پھانسی دی جا چکی ہوتی۔ مگر اللہ کا فیصلہ یہی تھا کہ کچھ اور باتوں کا بھی ہم تجربہ کریں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہماری تمنا اور آرزو کے باوجود گاڑی نہر کا نوالہ نہ بنی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے دل میں جو تمنا ابل رہی تھی وہی دوسروں کے دلوں میں تھی اور ہر شخص اللہ تعالیٰ سے ویسی ہی دُعا کر رہا تھا جو میں کر رہا تھا۔

اسماعیلیہ نہر (جسے ہم نہ دیکھ سکتے تھے) کے کنارے کنارے گاڑی چلتی رہی۔ گاڑی نے قاہرہ کی سڑکوں سے اُٹھنے والے شور و ہنگامہ کو بھی سنا جو طرح طرح کی آوازوں کی شکل میں اُٹھ رہا تھا۔ اور یہ آوازیں اس بدقسمت کارواں سے بالکل بے خبر تھیں۔ راستے میں بعض پولیس اسٹیشنوں اور خفیہ پولیس کے مراکز پر بھی گاڑی تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے رُکتی رہی۔ دو گھنٹے چلنے کے بعد یکایک ہمیں یہ محسوس ہوا کہ شور و غل دھیما ہو گیا۔ گاڑی کے انجن کی آواز کے سوا اور کوئی آواز ہمارے خوف و سراسیمگی میں حائل نہ ہو رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ ہم قصبہ نصر کی حدود میں داخل ہو گئے ہیں۔ اسی جگہ وہ خوفناک فوجی جیل پائی جاتی ہے جس کی دیواریں سنگ و خشت کی اور دروازہ تیرہ و تار ہے۔ جہاں بڑی ڈھٹائی اور درندگی کے ساتھ انسانی آزادی کو چیلنج کیا جاتا اور رقوم کا منہ چڑایا جاتا ہے۔

میرے دماغ میں شدید تہلکہ برپا تھا۔ میری روح سراپا بے تاب تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کس قدر ایک انسان اپنے ہم جنس انسان کے ساتھ اس خوفناک جگہ پر جسے فوجی جیل کہتے ہیں سنگدلی کا برتاؤ کرتا ہے۔ آخر یہاں مجھے کیوں طلب کیا گیا ہے؟ اور میں یہاں کیا کیا بھگتنے والا ہوں؟ گاڑی رُک گئی۔ خوف کے مارے یکایک میرا ذہن منجمد ہو گیا۔ اور پھر اس وقت احساسات میں تموّج پیدا ہوا جب آہنی زنجیر بجنے لگی اور میری ہتھکڑی مجھے باہر کی جانب کھینچنے لگی۔ ہم سب ایک ہی طویل زنجیر میں منسلک تھے۔ ٹھوس، گراں اور ٹھنڈی زنجیر جو قصبۂ نصر کی گرم اور خشک ہوا کے باوجود جسم و جان میں برودت پیدا کر رہی تھی۔

تیزی کے ساتھ ہم گاڑی سے نیچے اُتر آئے۔ میری دونوں آنکھیں بندھی ہوئی تھیں۔ میرے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی جو پہلے مدھم تھی اور پھر یکدم بالا ہو گئی اور پھر یہاں تک وہ خوفناک صورت اختیار کر گئی کہ کان پھٹنے اور جسم لرزنے لگا۔ یہ تازیانوں کی آواز تھی جو نہ صرف انسانی جسموں کے پرخچے اُڑا رہے تھے بلکہ ہوا کو بھی بُری طرح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چیر رہے تھے اور اس آواز کے ساتھ درندوں کی آوازوں سے ملتی جلتی آوازیں بھی اٹھ رہی تھیں۔ گویا روئے زمین کے تمام درندے یہاں ایک ہی میدان میں جمع ہو چکے ہیں۔ ان تمام آوازوں کے اندر ایک انسانی چیخ بھی کانوں میں پڑ رہی تھی، یہ تمیز کرنا مشکل تھا کہ یہ چیخ کسی مرد کی ہے یا عورت کی یا بچے کی۔ فوجی جیل میں تینوں قسم کے انسان تازیانے کھاتے رہے۔

ان لمحات میں میرا تخیل پکار اٹھا کہ دنیا کو بہرہ پن لاحق ہو چکا ہے۔ تہذیب و تمدن کے جسد میں سڑاند پیدا ہو چکی ہے جس نے اُس کی رُوح کو ناکارہ کر دیا ہے اور اُسے فنا کے گھاٹ اتار دیا ہے۔

ہم فوجی جیل پہنچ گئے۔ ہم گیٹ کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ قیود و سلاسل سے گراں بار۔ آنکھیں بندھی ہوئی۔ اسی اثنا میں فوجی آئے اور ہمیں تازیانوں کی ضرب سے اندر ہانک کر لے چلے۔ یہ ایک نرالا اور عجیب و غریب منظر تھا۔ میں اس کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ صرف تاریخ کی کتابوں میں جب ہم قدیم ترین ادوار کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس طرح کے مناظر ملتے ہیں۔ مثلاً قدیم تہذیبوں کے آغاز میں ہم دیکھتے ہیں کہ اسس غلاموں کی انقلابی تحریک کو کچلتا ہے اور ان کے لیڈر سپارٹاکس کو قتل کر دیتا ہے جس نے قدیم روما کو خطرے میں مبتلا کر دیا تھا۔ رومیوں کے عہد میں لیبیا کی کوئلے کی کانوں میں بھی شاید ایسی مثالیں مل جائیں۔ ان کانوں میں رومی حکمران غلاموں سے سارا دن، اور رات کا کچھ حصہ مسلسل سخت کام لیتے تھے، اور انہیں مضمحل اور نڈھال کر کے قتل کرتے تھے۔ فاتح رمسیس نے بھی حبشیوں اور یونت کے علاقے سے جو قیدی گرفتار کیے تھے ان کے ساتھ نہایت ظالمانہ سلوک کیا تھا۔ دورِ جدید میں سولھویں اور سترھویں صدی کے اندر روئی اور گنے کے کھیتوں میں مصر میں ایسی چند مثالیں مل سکتی ہیں۔ تاریخ کے اور ادوار میں بھی آپ کوئی نہ کوئی ایسی مثال تلاش کر سکتے ہیں۔ مگر بیسویں صدی کے اندر مصر میں اس طرح کے حالات کا عود کر آنا بڑا موجب حیرت ہے۔

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

میں یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ تاریک حالات تہذیب و تمدن کے تاریخی مرکز کے اندر بھی پیش آ سکتے ہیں جہاں ہمیشہ مختلف افکار و نظریات کی تحریکیں برپا رہیں۔ اور ہر نظریہ اور ہر تحریک انسان کی عظمت کے گن گاتی رہی اور انسانی آزادی کا علم بلند کرتی رہی۔ مگر اب مرکز تہذیب کی یہ تصویر بن چکی ہے کہ راہزنوں کا ایک ٹولہ ملک میں دندناتا پھر رہا ہے۔ یہ گھروں میں سے لوگوں کو اغوا کر لیتا ہے اور انہیں کسی گمنام اور تاریک جگہ لے جا کر ظلم و ستم کا نشانہ بناتا ہے۔ اڈولف ہٹلر ——— دنیا کے ملعون ترین انسان ——— کے عہد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں بھی شاید گسٹاپو کے جلادوں کو انسانوں کی تذلیل اور تعذیب کی وہ قدرت حاصل نہ ہوگی جو ان رہزنوں کو حاصل ہے ——— یہ کیسی متعفن اور سرخ آندھی ہے جو ان گرمیوں میں مصر میں اٹھی ہے۔

فوجی جیل میں داخل ہونا ایسا ہی ہے جیسے کسی تاریک جنگل میں داخل ہو جانا جو آدم خور درندوں سے بھرا ہوا ہو۔ درندوں کے بارے میں بھی میرا خیال ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انہیں جو دل دیا ہے وہ رحم و تلطف سے یکسر خالی نہیں ہے۔ مگر یہ رہزنوں کا ٹولہ جو سال بھر تک مجھے جیل کے اندر گوناگوں عذاب دیتا رہا۔ اس کا اندرون اس قدر کریہہ تھا کہ سوائے متعفن بگولوں کے اس میں سے کوئی چیز خارج نہ ہوتی تھی اور یہ بگولے ہر چیز کو بھسم کرتے جاتے تھے، اور ہر اس خوبی اور حسن کو ملیا میٹ کرتے جاتے تھے جو انسان کی فطرت میں پائی جاتی ہے۔

چیخ و پکار سے بھرپور فضا کے اندر ایک گرجدار اور کرخت آواز بلند ہوئی:

یہ کیا جمگھٹا ہے؟

یہ نئے نظر بند ہیں پاشا صاحب۔ یہ نظر بند ابو زعبل کی جیل سے لائے گئے ہیں۔

ان کی آنکھوں پر تم لوگوں نے پٹیاں کیوں باندھ رکھی ہیں؟

پاشا صاحب، سول انٹیلی جنس کا یہی ضابطہ ہے۔

پاشا صاحب نے ایک تمسخر آمیز قہقہہ لگایا اور کہا: سول انٹیلی جنس کے لوگ نظر بندوں کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دیتے ہیں کیونکہ وہ ڈرتے ہیں کہ آئندہ یہ کہیں ان سے انتقام نہ لیں۔ مگر ہم تو عذاب دیتے ہیں اور قتل کر دیتے ہیں۔ عذاب بھی اور قتل بھی۔ ہمیں کسی کا کوئی خوف نہیں ہے۔ جو یہاں آئے اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ ابدالآباد تک یا تو عبدالناصر کا غلام بے دام بن کر رہے (پاشا صاحب یہ فرما رہے تھے اور میرے ذہن میں قدیم مصر کے جادوگروں، فرعون اور ملک مصر کے مختلف مناظر گردش کر رہے تھے) اور یا پھر موت کا لقمہ بن جائے۔ اور اگر بالفرض وہ کسی ایسے سبب کی بنا پر جو ہمارے قابو سے باہر ہو، موت سے نجات پا جائے تو وہ زندگی بھر اس ملک بوس قلعے اور اس کی طرف آنے والے راستوں سے گریزاں رہے گا۔ پس ان چوہوں کی آنکھوں سے یہ غلیظ پٹیاں اتار دو۔

ہمارے منہ جیل کی دیوار کی طرف کر کے ہمیں ایک قطار میں کھڑا کر دیا گیا۔ طوق و سلاسل کھول دیے گئے۔ اور ہمیں حکم دے دیا گیا کہ ہم اپنی آنکھوں سے پٹیاں اتار دیں۔ پٹیاں کھولتے ہی یہ دیکھ کر لوگوں کی یوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چیخیں نکلیں جیسے کوئی ماتمی جلوس گزر رہا ہو یا وہ ایک خوفناک کنویں کے اندر اتر گئے ہیں اور نہ معلوم اس کے اندر ان پر کیا گزرنے والی ہے۔ جب ہم نے فوجی جیل کے اندر قدم رکھا تھا تو تمام تر دہشت کے باوجود میرے اندر سوچ بچار کی بچی کھچی طاقت باقی تھی۔ اسی بچی کھچی طاقت کے بل پر میں نے ہر آرزو، ہر تمنا اور خوب یا زشت ہر خواہش کو الوداع کر دیا۔ اور یہ اندازہ کر لیا کہ میں آخرت کے دروازے پر کھڑا ہو چکا ہوں۔ اور اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے مشفق و مہربان ہاتھوں میں دے دیتا ہوں وہ جو چاہے کرے۔ جو بھی ہوگا بہتر ہوگا۔ آخرت بہتر ہی ہوگی۔ ہر چہ بادا باد۔ اس کے ماسوا میں اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس موقع پر میں نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں دو شعر پڑھے۔ شاعر کا نام معلوم نہیں ہے:

لا تدبر لک امرًا	اپنے کسی کام کی تدبیر نہ کر
فاولوا التدبیر ھلکیٰ	تدبیر کرنے والے تباہ ہوتے
سلم الامر تجدنا	اپنا کام ہمیں سونپ دے
نحن اولیٰ بک منک	ہم تیرے لیے تجھ سے زیادہ خیرخواہ ہیں

میں نے اپنے آپ کو اس جگہ پر اللہ تعالیٰ کا مہمان تصور کر لیا۔ حالانکہ یہاں کا ہر ذمہ دار شخص نعوذ باللہ خدائے عظیم و برتر کو چیلنج کر رہا تھا۔ بزرگ و برتر ہے اللہ کی ذات اور بابرکت ہیں اس کے نام۔

محترم قارئین میں یہاں کے بارے میں آپ کے سامنے کیا کیا بیان کروں۔ یہ روز و لمحے سیاہ جب مجھے یاد آجاتے ہیں تو میرا رُواں رُواں کانپنے لگ جاتا ہے۔ اگر بھول کر بھی میری نظر ان ایام کی طرف اٹھ جائے تو اب بھی خوف و دہشت، الم و رنج اور غیظ و غضب کے جذبات کا سیل بے پناہ امڈ آتا ہے۔ فوجی جیل جس انسان کے بھی مقدر میں آئی ہے اس نے وہ بُرے سے بُرے حالات دیکھے ہیں جن کا انسانی زندگی کے اندر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ میرے احساسات کے مطابق دنیا کی تمام مصیبتیں مل کر اس ایک رات کے مساوی نہیں ہو سکتیں جو فوجی جیل کی بھیانک اور ٹھنڈی کوٹھڑیوں کے اندر گزرتی ہے۔ میں جو کچھ تفصیل بیان کروں اور جتنا زور بیان دکھاؤں فوجی جیل کی منظر کشی اور وہاں کے حالات کی پوری عکاسی نہیں کر سکتا۔

فوجی جیل کی قدیم روایات میں سے ایک روایت مسلسل چلی آرہی ہے جسے جیل کی اصطلاح میں "استقبال" کہتے ہیں۔ یہ روایت فوجی جیل کا ہر جلاد اپنے جانشینوں کو سونپتا چلا آرہا ہے۔ اور اب مرورِ ایام کے ساتھ یہ نمایاں اور اہم حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ یہ روایت یہ ہے کہ جلاد جب مصیبت زدہ قیدی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یا نظر بند کو وصول کرتا ہے تو مُنہ سے لیتے ہی اس قدر شدت کے ساتھ مارتا ہے کہ بعض اوقات وہ زندگی سے محروم ہو جاتا ہے۔ جلاد کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ گردن زدنی کے اصول کی روشنی میں یہ نیا قیدی آئندہ کے لیے سراپا عجز و اطاعت بن جائے اور کبھی جلادوں کے سامنے سر اٹھا کے نہ چلے۔ "استقبال" کے مرحلے سے ہمیں بھی گزرنا تھا۔ اس کی ہولناک کہانیاں ہم ابوزعبل کی جیل میں سُنا کرتے تھے۔ کیا میں "استقبال" کی تصویر آپ کے سامنے پیش کر سکتا ہوں۔ شاید نہیں۔ لیکن کوشش کروں گا:

فوجی جیل میں جب ہم داخل ہوئے تھے تو اُس وقت کیا فضا تھی، اِس کا مختصر خاکہ اُوپر بیان کر چکا ہوں۔ چیخیں بلند ہو رہی تھیں، ہائے وائے کی آوازیں پھیل رہی تھیں، جگر دوز آہیں اُٹھ رہی تھیں اور انسانی خون سے لت پت تازیانوں کی شائیں شائیں کانوں سے ٹکرا رہی تھی ——— ایسے میں چیرنے پھاڑنے والے کُتے لائے گئے۔ ان کتوں کی گردنوں میں زنجیریں لپٹی ہوئی تھیں اور سپاہیوں نے اُنہیں ہاتھوں میں لے رکھا تھا۔ ان کتوں نے بھونکنا شروع کر دیا۔ اور ہلکے ہلکے طریقے سے ہماری ٹانگوں سے اٹھکیلیاں کرنے لگے۔ ہم دیوار کو چمٹے ہوئے تھے اور خوف و دہشت کے مارے پتھر بنے جا رہے تھے۔ پھر سپاہیوں کی ایک تعداد بلائی گئی جو پچاس سے زیادہ تھی۔ اور اُن میں سے ہر شخص کو ایک مقررہ کرتب دکھانا تھا۔ یہ سپاہی بھی اُسی طرح تربیت یافتہ تھے جس طرح یہ کُتے۔ اور پہلے بھی اُسی طرح کے کام سرانجام دے چکے تھے۔ جو کتوں کے کام سے مشابہ تھے، ہر سپاہی کی یہ ڈیوٹی تھی کہ وہ ہم مصیبت زدگان کی قطار کے پاس سے گزرے اور ہم میں سے ہر شخص کی گُدّی پہ ایک مکہ رسید کرے۔ یہ مکہ کیا تھا گویا ایک بم تھا طاقت کے لحاظ سے بھی اور اذیت کے لحاظ سے بھی۔ میرے پہلو میں ایک آشفتہ حال بوڑھا کھڑا تھا، وہ اِس مُکّے کو برداشت نہ کر سکا اور فوراً زمین پہ ڈھیر ہو گیا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ مکّے کی تاب نہ لا کر گرا یا شدت خوف سے۔ قابلِ ذکر یہ بات ہے کہ وہ بے چارہ زمین پہ گر پڑا۔ مَیں بے تابانہ اُس کی طرف جھکا۔ میرا دل جوشِ ہمدردی سے پھٹا جا رہا تھا۔ بوڑھا بڑے دل گداز انداز میں سسکیاں بھر رہا تھا، اور خدا اور رسول کے واسطے دے رہا تھا، اور عجز و لجاجت کے ساتھ رحم کی اپیل کر رہا تھا۔ اسی حالت میں وہ یک بیک خاموش ہو گیا۔ ہمیشہ کے لیے خاموش۔ مجھے یقین ہے کہ خوف و دہشت کی شدت سے اُس کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

مجھے قطار میں سے الگ کر لیا گیا اور سب لوگ مل کر مجھے زد و کوب کرنے لگے یہاں تک کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش میں آیا تو اپنے آپ کو اپنے ساتھیوں کے اندر گوشت کے ڈھیر میں پایا۔ ہم سب کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مارا گیا تھا اور خوب مارا گیا تھا۔ یہاں تک کہ شدتِ جذبات سے ہم لوگ گوشت کا ڈھیر بن چکے تھے۔ کتے بڑے بھیانک اور وحشیانہ طریقے سے ہمارا خون چاٹ رہے تھے۔ اس رات کتوں نے کس قدر انسانی گوشت کھایا اور انسانی خون پیا یہ بیان سے باہر ہے۔

ہم راکھ کا ڈھیر بنے پڑے تھے کہ سپاہی چلا کر کہنے لگے کہ ہم کھڑے ہو کر نئے احکام سنیں۔ چنانچہ شدت آلام کے باوجود ہمارے لیے تعمیلِ حکم کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ہم کھڑے تو ہو گئے مگر ہمارے جسم کا ذرہ ذرہ سراپا شکایت، سراپا دکھ اور سراپا بے چارگی و ضعف تھا۔ حکم یہ صادر ہوا کہ ہم اس جگہ کی طرف مارچ کریں جہاں رات گزارنی ہے۔ دُنیا کی دوزخ کی پہلی رات۔ اس نئے حکم کے تحت ہم اس حصے کی طرف چل دیے جسے "بڑی جیل" کہا جاتا تھا۔

فوجی جیل کے چاروں طرف ایک اونچی دیوار ہے۔ اس کے اندر بڑی بڑی عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔ یہ عمارتیں نمبروں کے ساتھ موسوم ہیں۔ نمبر ایک عمارت "بڑی جیل" کہلاتی ہے۔ اس میں ٹھونس ٹھونس کر ایک ہزار آدمی بھرے جا سکتے تھے۔ اس کے اندر تقریباً تین سو کوٹھڑیاں ہیں۔ اور یہ تین منزلوں پر مشتمل ہے۔ اسی جگہ میں نے اپنی نظر بندی کی مدت بسر کی ——— نمبر ایک کے بعد نمبر دو، نمبر تین، نمبر چار ...... پھر اسپتال ہے جس میں وہی شخص داخل ہوتا ہے جو موت کے دروازے میں قدم رکھ چکا ہو۔ یا وہ بالفعل مر چکا ہو۔ پھر انتظامیہ کے دفاتر ہیں اور ان کے ساتھ ہی تعذیب گاہیں۔ فوجی جیل کے اندر ہی ایک خوبصورت اور نفیس بنگلہ ہے جس میں جیل کا جلاد اعظم حمزہ البسیونی رہتا ہے۔ یہ وہی شخص ہے کہ جب تاریخ کے اندر تشدد، قتل، تعذیب اور تذلیل کے ابواب لکھے جائیں گے، تو یہ شخص ہر باب کا سرنامہ ہوگا۔ ان عظیم عمارتوں کے وسط میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے جو افسردگی و ندامت کے ساتھ محوِ سکوت ہے۔ اور حیرت کی نظروں سے اُن تمام واقعات کا مشاہدہ کر رہی ہے جو اس کی نظروں کے سامنے سرانجام پا رہے ہیں۔ جیل کی ڈیوڑھی میں جہاں ہمارا تین گھنٹے تک "استقبال" کیا گیا اور بڑی جیل کے درمیان جہاں ہم رہ رہے ہیں، تقریباً دو سو پچاس میٹر کا فاصلہ ہے۔

ہمیں حکم ملا کہ ہم بڑی جیل کی طرف جانے والا راستہ رہنما کے بغیر طے کریں حالانکہ یہ راستہ پیچ در پیچ تھا۔ اور ہم اس سے ناواقف تھے۔ سپاہیوں کے تازیانے ہمیں ہانکتے ہوئے لیے جا رہے تھے۔ اور ہر شخص کو حکم تھا کہ وہ اپنے ساتھی کی گردن پر مکہ رسید کرے۔ اور اگر ایسا نہ کرے گا تو اس کے لیے سراسر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تباہی اور بربادی ہے۔ ہم بڑی جیل کے میدان میں مار کھاتے ہوئے شکستہ دپژمردہ پہنچ گئے۔ یہ معلوم کرکے ہمارا خوف اور شدید ہوگیا اور ہم پر دہشت مزید طاری ہوگئی کہ ہمیں ایک اور "استقبال" سے گزرنا ہے۔ یہ مقامی استقبال ہے جو بڑی جیل کے میدان میں ترتیب دیا جائے گا۔

یہ میدان وسیع اور مربع ہے۔ اس کا عرض ایک سو پچاس میٹر ہے۔ اس میدان کے ایک گوشے میں ——— جہاں مصر کے بے شمار فرزندان اسلام قتل کیے گئے ——— ایک کنواں ہے۔ جو بڑی جیل کے دروازے کے دائیں جانب واقع ہے۔ یہ کنواں پانی سے بھرا ہوا ہے اور اس کی منڈیر کے پاس لوہے کی ایک مستطیل میز ہے جہاں بالعموم جیل کے پہرہ دار بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ ہم اس میدان میں داخل ہوگئے اور تعمیلِ احکام کے طور پر ہم نے دیوار کی جانب منہ کرلیے۔ پہرہ داروں کی ایک جماعت جو کھانے پینے میں مشغول تھی سُرعت کے ساتھ ہماری طرف بڑھی۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ پہرہ دار سپاہی کھانے پینے کی اشیاء پر جو انہوں نے قیدیوں سے چھینی ہوتی ہیں سوائے تعذیب کے کسی چیز کو ترجیح نہیں دیتے۔ ہمیں دیکھ کر وہ کھانا چھوڑ کر ہماری طرف لپکے تاکہ کھانے سے بھی زیادہ "مرغوب غذا" سے محظوظ ہوں۔ یعنی ہمیں ٹھوکریں مارنے، تازیانے لگانے اور دیگر طریقوں سے آزار پہنچاتے کی لذت حاصل کریں۔ اور یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے۔ آپ کو بہت سے ایسے منحرف الفطرت انسان ملیں گے جنہیں انسانی خون کی لت لگ جاتی ہے اور وہ جب تک اپنی اس لت کو پورا نہ کرتے رہیں چین سے نہیں سو سکتے۔

بڑی جیل کی "استقبالیہ محفل" دو گھنٹے تک جاری رہی۔ اسلوب کے لحاظ سے یہ استقبال ویسا ہی تھا جیسا ملٹری جیل میں کیا گیا۔ لیکن وحشت و درندگی کے لحاظ سے یہ اس سے فوقیت لے گیا۔ ہماری نقدی ہم سے لے لی گئی، ہاتھوں میں سے گھڑیاں بھی اتار لی گئیں، قلم بھی رکھوا لیے گئے۔ اور بعض اچھے اچھے کپڑے جو سپاہیوں کو پسند آئے انہوں نے چن لیے اور پھر ہمیں سٹور نمبر ۱ میں بند کر دیا گیا۔ اس حال میں کہ شکستہ و کوفتہ تھے۔ بھوکے تھے اور پیاسے۔ محسوس ہوتا تھا کہ ابھی کوئی بلا اس دنیا سے ہمیں اچک کر لے جائے گی۔

(باقی)

© rasailojaraid.com